

اسلام کی سرچستہ

علی گڑھ سیمینار
میں
مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی تقریر

قدیم اور جدید دانشوروں کے لئے لمحاتِ فکر

۲۵ جنوری، ۱۹۷۷ء کو اس سیمینار کا اختتامی جلسہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے پروفیسر وائس چانسلر پروفیسر محمد شفیع صاحب کی صدارت میں ہوا۔ اس موقع پر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (ناظم ندوۃ العلماء) سے اختتامی خطاب کی فرمائش فتنطین جلسہ نے کی، شرکاء جلسہ میں پروفیسر اے۔ ایم خسرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جناب بدرالدین طیب جی سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ڈاکٹر مسعود حسین خان وائس چانسلر جامعہ ملیہ دہلی اور وہ سب فاضل مقالہ نگار موجود تھے، جنہوں نے چار روزہ سیمینار میں اپنے مقالات پڑھے اور بحث و گفتگو میں حصہ لیا، ان کے علاوہ یونیورسٹی اور شہر کے متعدد صاحبِ ذوق اصحاب اور خواتین موجود تھیں۔

بہارت اور اختصاص ضروری ہے | حضرات! میں آپ کی اس عزت افزائی کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اس علمی مجلس کے افتتاح کے موقع پر اپنے خیالات کے انہار کا موقع دیا، اب اس کے آخری نشست کے اختتام پر بھی مجھے تقریر کا موقع دیا ہے، آغاز و انجام میں خاص مناسبت ہے، میں آپ کے اس اعتماد و اعزاز کے لئے دل سے شکر گزار ہوں، مجھے بڑی مسرت ہے کہ علومِ اسلامیہ اور دینی موضوعات سے کچھ عرصہ سے عصری دانش گاہوں کے فضلاء بھی دلچسپی لینے لگے ہیں، اور یہ سیمینار اس کی دلیل ہے، اب علومِ اسلامیہ کے ایک خادم اور میدانِ تحقیق کے پرانے مسافر کو اقبال کے الفاظ میں یہ کہنے کا حق ہے کہ

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں یہاں اب میرے راز و اداں اور بھی ہیں

دماغی صلاحیتوں کا خزانہ کسی ایک طبقہ میں مرکوز نہیں ہے، نہ کبھی مرکوز رہا ہے، اور نہ کبھی مرکوز ہو سکتا ہے، اور ایسا ہونا کچھ اچھا بھی نہیں، اس طبقہ کے لئے خواہ یہ بات کتنی ہی نازش و افتخار کی ہو لیکن انسانیت کے حق میں یہ کوئی بہتر بات نہیں ہے کہ انسانی ذہنوں کا خزانہ اور محنتوں کا ذخیرہ کسی ایک طبقہ میں مرکوز ہو کر رہ جائے، جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، آپ سب جانتے ہیں کہ اسلام میں علمائے دین کا کوئی مخصوص

مردوثی طبقہ نہیں ہے، کلاسیکی (CLERGY) اور پریسٹ ہڈ (PRIST HOOD) کا تخیل مسیحی دنیا میں ملتا ہے، اس کا دنیا سے اسلام میں کہیں وجود نہیں، اگر ہمارے بعض اہل قلم مصنفین کی تحریروں میں کچھ ایسی تعبیرات اور الفاظ آتے ہیں تو بے سوچے سمجھے یا مغرب کی تقلید میں مثلاً اس وقت عرب مصنفین کے یہاں رجال الدین کا ایک لفظ استعمال ہوتا ہے، جو تقریباً اسی معنی میں ہے۔ جو مسیحی دنیا میں پریسٹ ہڈ (PRIST HOOD)

کے لئے استعمال ہوتا تھا، اس لئے محتاط مصنفین نے جو اسلام کی صحیح روح اور صحیح فکر کی ترجمانی کرنا چاہتے ہیں، ان لفظوں سے ہمیشہ احتراز کیا ہے۔ لیکن علوم اسلامیہ کی طرف عصری دانش گاہوں کے فضلاء کی توجہ پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بھی میں یہ اضافہ کروں گا کہ کلاسیکی (CLERGY) اور پریسٹ ہڈ —

(PRIST HOOD) اسلام میں نہیں ہے، لیکن ایکسپٹ (EXPERT) اور سپیشلسٹ (SPECILIST) ماہرینِ فن اور اصحابِ اختصاص کا وجود ہمیشہ رہا ہے۔ اور یہ ایک علمی حقیقت ہے، اس لئے کہ علوم اتنے پھیل گئے ہیں، اور ان میں اتنا تنوع اور وسعت پیدا ہو گئی ہے۔ کہ ایک آدمی کے لئے ہمدواں ہونا عملاً ناممکن ہے، یورپ میں بھی ترقی اس وقت سے شروع ہوئی جب وہاں تقسیم کار کے اصول پر عمل کیا گیا، اور علوم کے مختلف شعبے تقسیم ہو گئے۔ اور اسکی کوشش مغربی فضلاء نے چھوڑ دی کہ وہ تمام علوم میں اتھارٹی اور سند کا درجہ حاصل کریں، جہاں تک مجھے علم ہے، یورپ میں اب بھی اس اصول کا احترام مشرق سے زیادہ کیا جاتا ہے، وہاں کسی علم کے فاضل بھی بعض اوقات اس علم کے بعد متعلقات کے متعلق بغیر کسی — شرم و مذمت کو محسوس کئے کہہ دیتے ہیں کہ یہ ہمارا موضوع نہیں، اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے ہمیں اس کو اہول کے تحت تسلیم کر لینا چاہئے کہ ہماری آئندہ و پچسپیاں اور ہماری علمی اور تصنیفی سرگرمیاں کسی خاص موضوع یا فن کے ساتھ مخصوص ہوں گی۔

معیار کی طرف توجہ کی ضرورت ہے | مجھے خوشی اور فخر ہے کہ میں آپ کا ہم سفر ہوں، ہم سفری کے اس حق سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں آپ کے سامنے چند باتیں عرض کر دینا چاہتا ہوں، آپ اس کو کسی تعریف پر عمل نہ فرمائیں، پہلی بات جسے میں محسوس کر رہا ہوں، اور آپ میں سے بہت سے لوگ محسوس کر رہے ہوں گے بہت سے سینئر اسکالرز یہاں موجود ہیں جن کے ۳۰، ۴۰ برس اس صحرا نوردی میں گزرے ہوں گے کہ علم و تحقیق کا معیار روز بروز گھٹتا جا رہا ہے۔ مجھے یورپ کے سفروں میں بھی اس کا احساس ہوا اور میں نے بعض فضلاء سے

بھی سنا دیاں بھی اوٹھیل ازم کا جہاں تک تعلق ہے یعنی مشرقی مباحث پر لکھنے کا اس کا معیار فروتر ہو گیا ہے۔ اوہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ جتنی محنت اور جیسا عشق اور لگن گذشتہ نسل کے فضلاؤں میں تھی اس میں کمی ہے۔ اس کے پیچھے بہت سے عوامل اور FACTORS کام کرتے ہیں کچھ سیاسی ہیں کچھ معاشی ہیں۔

استشرق کی ترقی کارزار | ہر علم کے پیچھے بعض بہت طاقتور محرکات ہوتے ہیں، ان عوامل و محرکات نے

اوٹھیل ازم کو ایک زمانہ میں چوٹی پر پہنچا دیا تھا، فرس اور لکنا لوجی یا اکنامکس کے چند دائروں کو چھوڑ کر جہاں تک علمی اور نظری مباحث کا تعلق ہے، اوٹھیل ازم کو جو یورپ میں اعزاز حاصل تھا، مستشرقین اور ان کی کتابوں کی اس طرح قدر ہوتی تھی، وہ کم علوم کو حاصل تھی، یہاں تک کہ ادبیات اور لسانیات کے علوم کو بھی شاید وہ درجہ نہیں دیا جاتا تھا، اس کے پیچھے ایک بہت بڑا عامل یا FACTOR کام کر رہا تھا، ہم کو خوشی ہوئی چاہئے کہ اب وہ باقی نہیں رہا، وہ تھا استعمار، مشرق کے سب سے زیادہ سرسبز و شاداب ممالک بد قسمتی یا خوش قسمتی سے مسلمانوں کے زیر اثر تھے، ان پر مغرب کی پلچائی ہوئی نگاہیں پڑ رہی تھیں۔

استعماری نئی نوآبادیاں (COLONIES) قائم کرنا چاہتا تھا، اس لئے وہاں کے قومی مزاج اور خصوصیات اور ان کی خوبیوں سے زیادہ کمزوریوں سے واقف ہونے کی ضرورت تھی، اس کے لئے مستشرقین ایک ہراول دستہ (POINEER) کا کام کرتے تھے، ان کے پیچھے حکومتوں کی سرپرستی تھی، بڑے بڑے فنڈ اور بڑے بڑے ادارے تھے۔ اور ان کا اکرام بادشاہ اور صدر جمہوریہ کے دربار میں بھی ہوتا تھا، یہ FACTOR عرصہ ہوا کمزور پڑ گیا ہے۔

دوسرا معاشی عامل FACTOR تھا، اس پر بھی کچھ اثر پڑا ہے، معاشی ڈھانچہ میں ایسی تبدیلیاں ہوئی ہیں کہ اب وہ انعام ملنا مشکل ہے جو پہلے ملتا تھا۔

علم کا عشق | تیسری چیز جو زیادہ توجہ کے قابل ہے، اور اس کو میں اصل سمجھتا ہوں وہ ہے علم کا عشق جو ہماری پہلی نسل میں تھا، ایک لگن اور خود فراموشی کی کیفیت جو اس عہد میں تصنیفی اور تحقیقی کلام کرنے والوں پر طاری رہتی تھی۔ یہ بات کسی خاص دانش گاہ یا جامعہ کو سامنے رکھ کر نہیں کہہ رہا ہوں، یہ میرا عام مطالعہ ہے، تقریباً سب جگہ یہ محسوس کیا جا رہا ہے۔ اور بد قسمتی کی بات ہے کہ علم سے عشق جو ہمارے اسلاف میں پایا جاتا تھا، اسلاف سے مراد مسلمانوں ہی کے اسلاف نہیں بلکہ گذشتہ نسل میں پایا جاتا تھا، وہ اب بہت کم نظر آتا ہے۔

نواب صدیق جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کی کتاب "علمائے سلف" جو انہوں نے اسی علی گڑھ میں لکھی ہے اس کو پڑھنے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ علم کا عشق اس وقت کے مصنفین اور محققین کے دلوں میں کیسا موجزن تھا، اور آج اس میں کس قدر نمایاں انحطاط ہوا ہے۔ یہ انحطاط کیوں ہوا؟ اس کا تعلق سیاست

معاشیات، ادبیات اور اخلاقیات سب سے ہے، اس کے پرے اسباب کا تجزیہ کرنا اس وقت نہ ضروری ہے اور نہ اس کی گنجائش ہے، لیکن اتنی بات آپ تسلیم کریں گے اور ہمارے معزز شہ کار اور ہم معززوں اس کو تسلیم کریں گے کہ علم سے عشق، شمع علم پر پروانگی کی کیفیت، علم و تحقیق کا ایسا جنون کہ کھانے پینے، کپڑے کا ہوش نہ رہے، آج مفقود بلکہ معدوم نظر آتا ہے، علماء دلت کے واقعات کو چھوڑ دیجئے، اسی علی گڑھ میں جو علماء پیدا ہوئے، مولانا لطیف اللہ علی گڑھی ان کے اس عشق کو دیکھتے اور اس کو بھی آپ چھوڑ دیجئے، اس وقت کے مغربی مصنفین کے یہاں 'لین' (LANE) جس کا عربی لغت انگریزی دالوں کے لئے ہی نہیں بلکہ عربی ادب کے ان فضلاء کے لئے بھی قابل استفادہ ہے، جو تفصیلات میں جانا چاہتے ہیں، اور وہ مراد لکھا دیکھنا چاہتے ہیں، جو بعض اوقات بہت سے عربی لغتوں میں بھی نہیں ملتا، میں نے سنا ہے کہ قاہرہ میں جب وہ اس لغت کا کچھ حصہ تیار کر رہا تھا، تو ہمیں گزر گئے وہ کہیں نہیں گیا اس کو تپہ نہیں تھا کہ بازار کہاں ہے، بازاروں میں جانے اور اہرام مصر جیسے عجائبات عالم کو دیکھنے کی فرصت نہ تھی، اس کو آپ بد مذاتی یا مردہ دلی پر محمول کر سکتے ہیں، لیکن یہ واقعہ ہے، بہت سی لازوال اور لافانی تصانیف کی تاریخ اگر آپ دیکھیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان کے مصنفین پر خود فراموشی کا عالم طاری تھا، یہ وہ چیز تھی جس نے مغرب و مشرق کے مصنفین کے قلم سے وہ زندہ حمادید تصانیف اور ایسی تحقیقات نکلائی (جس سے اختلاف کے باوجود) ان کی علمی قدرو قیمت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

ماضی قریب کی علمی شخصیتیں | میرا روئے سخن خالص اپنے ان دوستوں سے ہے، جو کھنے پڑھنے کا کام کرتے ہیں، مثال کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ مولانا شبلی نے کتب خانہ اسکندریہ پر قلم اٹھانے کی ضرورت محسوس کی، ایک زمانہ تھا، جب ہندوستان میں مشترک دانشگاہوں میں پڑھنے والے مسلمان طلباء کو پڑھانے کیلئے صرف یہ کہنا کافی تھا، اچھا آپ اس نسل اس مذہب سے تعلق رکھتے ہیں، جس کے خلیفہ نے اسکندریہ کا کتب خانہ جلوا دیا تھا۔ ابھی وہ لوگ موجود ہیں جنہوں نے وہ زمانہ پایا ہے، وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم لوگ منہ چھپاتے تھے، بلکہ منہ چراتے تھے، اور آنکھیں نہیں ملا سکتے تھے کہ اس کا کیا جواب دیں، ایک چلی ہوئی کہانی تھی کہ حضرت عمرؓ کو لکھا گیا کہ یہاں ایک کتب خانہ ہے، جو ظہور اسلام سے پہلے کا ہے۔ اور اس میں فلاسفہ کی اور منطقوں کی کتابیں ہیں تو اس کو آگ لگا دی چلتے چلتے چنانچہ لوگوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ قرآن کے خلاف ہیں، اور بغیر پڑھے کتب خانے کو آگ لگا دی، یہ ایک کہانی تھی، جس کو ٹائٹل بی (TOYN BEE) جیسا مورخ تک دہراتا ہے، ٹائٹل بی (TOYN BEE) نے جب رسم الخط کی تبدیلی اور کمال آنا ترک کی اصلاح پر تبصرہ کیا تو اس نے کہا اب کتب خانہ اسکندریہ کو جلاسنے کی ضرورت نہیں صرف رسم الخط بدل دینا کافی ہے، علامہ شبلی نعمانیؒ نے اس پر قلم اٹھایا، اور اس افسانہ کو آخری طور پر ختم کر دیا، اب کسی پڑھے لکھے کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ یہ کہے کہ کتب خانہ اسکندریہ حضرت عمرؓ کے زمانہ

خلافت میں ان کے حکم سے جلایا گیا، انہوں نے قدیم مؤرخین کی شہادتوں سے ثابت کر دکھایا کہ کتب خاند اسکندریہ حضرت عمرؓ کی خلافت سے پہلے ہی جل چکا تھا، اس کا کہیں وجود ہی باقی نہیں تھا، یا مثلاً انہوں نے جدویہ کے مسئلہ پر قلم اٹھایا تو اس بحث ہی کو ختم کر دیا، یا انہوں نے شعرا لعم کے تو اہل ذوق اور فارسی دانوں سے اپنا لوہا منوا لیا، پروفیسر براؤن (PROF. BROWN) (جن کی کتاب "تشریحی مہر آفت پرشیا" اپنے موضوع پر GOSPEL کا درجہ رکھتی ہے، اور دنیا کی اکثر یونیورسٹیوں کے کورس میں داخل تھی) نے کہا کہ مجھے اب اردو سیکھنے کی تمنا پیدا ہوتی ہے تو اس لئے کہ میں براہ راست شعرا لعم کا مطالعہ کر سکوں، یہ سب اس علمی شغف اور علمی استغراق کا نتیجہ تھا، جو ان لوگوں پر طاری تھا۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ جن کا اصل موضوع قرآن مجید، سیرت نبویؐ اور تاریخ اسلام تھا، انہوں نے عمر خیامؒ پر ایک ایسی کتاب بھی جس کی داد فضلاء ایران نے بھی دی، اسی طرح ان کی کتاب "عرب و ہند کے تعلقات" محنت و کاوش اور ریسرچ کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

میں اس موقع پر "نہایتہ الخواطر" کا بھی ذکر کر دوں گا، جو میر سے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحیؒ (سابق ناظم ندوۃ العلماء) کی تصنیف ہے، اور عربی میں اٹھ ضخیم جلدوں میں مکمل ہوئی، اس میں ہندوستان کے سارے چار ہزار مشاہیر اور اہل کمال کے تذکرے ہیں، انہوں نے بیسویں صدی کے آغاز میں اس کام کا بیڑا اٹھایا، جب عربی مطابع کا رواج اور اشاعت کی سہولتیں نہیں تھیں، تقریباً ۲۵ سال وہ اس کام میں مشغول رہے، اس وقت یورپ میں بھی یہ کتاب ہندوستانی علماء و فضلاء کے حالات معلوم کرنے کا سب سے بڑا ماخذ ہے، اسی طرح ان کی دوسری کتاب "الثقافة الاسلامیة فی الهند" جو ہندوستان میں علوم اسلامیہ اور نصاب درس کی تاریخ اور ہندوستانی علماء کی تصانیف کی مکمل ڈائرکٹری ہے، اس کتاب کو دمشق کی رائل اکیڈمی - "المجمع العلمی العربی" نے ۱۹۵۷ء میں شائع کیا، میں نے وہاں کی علمی مجسموں میں بڑے بڑے فضلاء کو اس کی تعریف اور مصنف کی محنت کا اعتراف کرتے ہوئے پایا۔

علم محنت بھی ہے اور انعام بھی | ایک آدمی اس وقت وہ کام کرتا تھا جو ایک اکیڈمی اس وقت انجام نہیں دیتی، یہ سب ایک آدمی کی محنت کا نمود، ایک آدمی کی محنت کا کرشمہ، ایک آدمی کے علم سے عشق کا نتیجہ ہے، آج اکیڈمیاں، بڑے بڑے ادارے اور شعبے موجود ہیں، لیکن سالہا سال میں وہ کوئی ایسی پیش کش نہیں کر پاتے جس کو دیکھ کر اس علم کے ماہر کہیں کہ ہاں یہ اور بحال (ORIGINAL) چیز ہے، بعض کتابیں دیکھ کر غالب کا وہ مصرع پڑھنا پڑتا ہے۔ ع۔

اب آبروئے شہرہ اہل نظر گئی

محنت کے معیار کو بڑھانے کی ضرورت ہے، علم محنت بھی ہے، انعام بھی ہے۔ پیاس بھی ہے، پانی بھی بھوک بھی ہے غذا بھی۔

جب تک اپنے فن سے اتنا تعلق نہ ہو کہ آدمی کو کتاب لکھنے پر اتنی خوشی ہو کہ وہ کہے اب مجھے اس ڈیپارٹمنٹ کا چیرمین بنایا جائے یا نہ بنایا جائے، میں نے اپنا کام کر دیا، میری محنت وصول ہوگئی۔

آج کے فضلا اپنی کتاب اور تحقیق کو مکمل نہیں کر چکے کہ وہ اس کے انعام کے متوقع ہو جاتے ہیں۔ سب کی نگاہیں عہدے اور منصب کی ترقی، شہرت و ناموری اور تنخواہوں کی بیشی پر لگی ہوئی ہیں، اور ان کی ذہانت و توجہ کا بڑا حصہ اسی مقصد پر صرف ہوتا ہے۔ آپ بہت سے ISMS سے واقف ہیں، ایک نئے ISM کا اضافہ کر لیجئے جو ہماری دانش گاہوں اور تعلیمی مرکزوں میں تیزی سے پھیل رہا ہے۔ اور وہ ہے: CAREERISM (کیریریزم) یعنی CAREER کو بہتر بنانا اور تقرب اور علم کے ذریعے جاہ طلبی۔

دکھپی اور شغف عارضی نہ ہو | دوسری چیز یہ کہ یہ دکھپی اور شغف عارضی نہ ہو مثلاً کسی سینار کے لئے ہم کسی موضوع کو اپنے اوپر تھوڑی دیر کے لئے طاری کر لیں پھر اس کے بعد جیسے جگالی کی جاتی ہے۔ پڑھ کر ہم اس کو اگل دیں اور نہ ہمیں اس موضوع سے محبت ہو اور نہ وفاداری ہو نہ فکر ہو کہ اس سلسلے میں کیا ہوا، نہ اس میں اضافہ کرنے کا شوق ہو، اس موقع پر اقبالؒ سے مدد لیتا ہوں۔ انہوں نے اسی حقیقت کو خوب بیان کیا ہے کہ مقصود ہنس و سوز حیاتِ ابدی ہے یہ ایک نفس یا دو نفس مثل شرک کیا

علم اور تحقیق بھی ایک ہنس ہے، اور اس ہنس کو زندگی بھر کا ساتھ دینا چاہئے، اس میں مقصدیت پیدا ہونی چاہئے وہ مثل شر نہیں کر بھڑکا اور سمجھ گیا۔

علوم اسلامیہ کے سوتے ایمانیات سے ملتے ہیں۔ | جہاں تک علوم اسلامیہ کا تعلق ہے، آپ بیشک اجتہاد کی ضرورت پر متاعے پڑھیں ہم سب اس کو تسلیم کرتے ہیں، یہ الگ بات ہے کہ اس کا دروازہ بند ہو جانے کے اسباب کیا تھے، اور کہاں تک جائز تھے، لیکن میں ایک بات کہوں گا، جہاں تک علوم اسلامیہ کا تعلق ہے۔ اس کے کچھ سوتے ایمانیات سے ملتے ہیں، بلکہ ان کا اصل سرچشمہ وہی ہے، اس لئے ہمارا طرز عمل ان کے بارے میں وہ نہ ہونا چاہئے۔ جو ایک غیر مسلم مستشرق (ORIENTALIST) کا ہوتا ہے۔ کہ ہم صرف بحث کریں اور ہمیں نہ اس سے کوئی دکھپی ہو، نہ اس سے اتفاق ہو، ایک حد تک اتفاق بھی ہونا چاہئے۔ اور کسی حد تک ہماری عملی زندگی میں اس کی نمود بھی ہونی چاہئے، میں اپنے بچپن میں ایک حکیمانہ مقلد سنا کرتا تھا کہ ”ایک من علم راہ من عقل باید“ ایک من علم ہو تو دس من عقل ہونی چاہئے۔ ورنہ آدمی اس کا صحیح استعمال نہ کر سکے گا، تو میں یہ ترسیم کر دں گا کہ تحقیق کی کسی بڑی سے بڑی مقدار کے ساتھ کسی تناسب سے تقویٰ بھی ہونا چاہئے، اس لئے

کہ یہ مسئلہ علوم اسلامیہ کا ہے جس کا تعلق ایمانیات سے ہے، اگر ہم اس پر اس طرح عمل جراحی کرتے ہیں، جیسا کسی مردہ لاش کا پوسٹ مارٹم کیا جاتا ہے، تو یہ مناسب نہیں، تنقید میں کسی قسم کی توہین یا تضحیک کی شان نہیں ہونی چاہئے کہ طنزیات و تضحیک کو خالص علمی مزاج سے کوئی مناسبت نہیں، آپ کا اپروچ APPROACH خالص علمی SCIENTIFIC خالص اکیڈمیک ACADEMIC ہو۔

جو لوگ علم کی ذمہ داریوں اور تحقیقات و نظریات کی تغیر پذیر مہم سے واقف ہیں، وہ اپنے کسی علمی نظریے یا تحقیق کے پیش کرنے میں جزم و وثوق اور قطعیت کے الفاظ استعمال کرنے سے احتراز کرتے ہیں، وہ اپنے کسی نئے خیال کو اس طرح نہیں پیش کرتے کہ وہ گویا اس موضوع پر حرف آخر اور تمام پھیلی تحقیقات پر خط نسخہ پھر دینے والا ہے، وہ کہتے ہیں کہ میرے اس وقت کے مطالعہ اور تحقیق نے اس نتیجہ تک پہنچا یا ہے۔ لیکن ہے کہ آئندہ اس میں تبدیلی کرنی پڑے یا کوئی نئی بات ثابت ہو، یا مجھے اندیشہ ہے کہ یہ بات اس طرح ہو، مجھے بدرالدین طیب جی کا یہ جملہ پسند آیا جو انہوں نے کل ایک نشست کی صدارت کرتے ہوئے ایک مقالہ نگار سے کہا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ آپ کا وقت ختم ہو گیا ہو، (I am afraid your time is over) وہ یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ حضرت آپ کا وقت ختم ہو گیا ہے۔ لیکن انہوں نے اس کو بڑے لطیف انداز سے ادا کیا، ہم اس سے سبق لے سکتے ہیں، فلم کیٹریں تو آپ کو اوّل سے آخر تک علم کا احترام اور اس شخص کا احترام بھی ملحوظ رکھنا چاہئے جس نے اپنا وقت صرف کیا، جس نے اپنی آنکھیں خراب کیں، جس نے اتنا مواد فراہم کیا۔

عربی زبان کی اہمیت | عربی زبان کی اہمیت بنیادی چیز ہے، اگر آپ کو علوم اسلامیہ پر کوئی کام کرنا ہے تو یہ بڑے نقص (DISQUALIFICATION) کی بات ہوگی، آپ عربی سے نا آشنا ہوں۔

قرآن، حدیث اور اسلامیات پر لکھنے والے بہت سے مشرقی اور مغربی فضلا سے عربی نہ جاننے کی وجہ سے نادانستہ ایسی غلطی ہو جاتی ہے، جو بعض اوقات ان کے پورے علمی کارنامے پر پانی پھیر دیتی ہے۔

مجھے ایک دوست نے بتایا کہ دہلی میں کوئی سینما ہو رہا تھا، اس میں ایک صاحب جنہوں نے انگریزی میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا تھا، تقریر کر رہے تھے، تو مشہور عرب ادیبہ اور مریضہ عائشہ بنت الساطی نے جو اس سینما میں شریک تھیں، ان سے عربی میں خطاب کیا تو انہوں نے بے تکلفی سے کہا کہ میں عربی نہیں سمجھتا تو عائشہ نے کہا کہ قرآن مجید کا ترجمہ چھ آپ کیسے کرتے ہیں۔ اس کے بعد وطن ہالک انہوں نے مصر کے کثیر الاشاعت اخبار "الابرار" میں اس پر کئی قسطوں میں مضمون لکھا کہ "میں نے عجائبات عالم میں سے ایک عجیب چیز دیکھی کہ ایک فاضل نے قرآن مجید کا ترجمہ کیا اور وہ عربی سے ناواقف تھا۔"

آپ حضرات آسانی کے ساتھ اس پر قابو پا سکتے ہیں، اور عربی زبان میں وہ دسترس حاصل کر سکتے ہیں۔

جس سے آپ غلطیوں سے بچ سکیں، اس سلسلے میں عربی مدارس آپ سے بھرپور تعاون کریں گے۔

انتشار انگیزی سے احتراز کیجئے۔ | بعض فضلا اپنے نظریات و تحقیقات کے اظہار میں بہت عجلت

سے کام لیتے ہیں، ان کی اشاعت ہو جاتی ہے۔ پھر وہ کچھ عرصہ بعد خود ہی ان سے رجوع کر لیتے ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنا اخلاقی فرض انجام دیتے ہیں، لیکن جو لوگ اس عرصہ میں ان نظریات و تحقیقات کے ساتھ

اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں، ان کی ذمہ داری کس پر ہے۔ یہ مسئلہ اور زیادہ سنگین ہو جاتا ہے۔ جب اس کا تعلق ایمانیات اور عقائد سے ہو، اس لئے ہمیں اپنی تحقیقات کی اشاعت و تبلیغ کے بارے میں

(خاص طور پر جب ان کا تعلق عقائد اور دینیات سے ہو) عجلت اور بے مبری سے کام نہیں لینا چاہئے۔

ان پر بار بار غور کرنا چاہئے۔ ان کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھنا چاہئے۔ ہائرین فن کے سامنے پیش کرنا

چاہئے اور ان کی رائے اور مشورہ کا انتظار کرنا چاہئے۔ پھر اس کے بعد اس کی اشاعت کی اجازت دینی چاہئے،

یہ دور انتشار ہے، اس وقت طبیعتیں انتشار انگیزی کیلئے ہر وقت آمادہ ہیں، انسان ہمیشہ سے سہولت

پسند اور جلد جو واقعہ ہو اسے، جدید تمدن نے، سائنسی ترقی کی رفتار نے اور معیار زندگی کی بلندی نے

اس کو زیادہ سہولت پسند اور انتشار پسند بنا دیا ہے، اس لئے ہم ایسی بات کہنے سے احتراز کریں جس سے

لوگوں میں انتشار پیدا ہو۔

۱۹۶۷ء میں جب عربوں کو اسرائیل کے مقابلہ میں شکست فاش ہوئی تو میں نے اپنے ایک انٹرویو

میں کہا تھا کہ اس میں بہت بڑی ذمہ داری ان تشکیک پسند ادباء اور مصنفین پر ہے جنہوں نے ہماری

جدید عرب نسل کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا، تمام قدیم اقدار کو انہوں نے متزلزل کر دیا۔

میں شکر گزار ہوں داس چانسلر صاحب پر داس چانسلر صاحب پروفیسر حقی صاحب اور ان

سب حضرات کا جو اس سینار سے تعلق رکھتے ہیں کہ انہوں نے مجھے عزت بخشی اور بڑے اعتماد کا اظہار

کیا، میں پورے وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ میں نے جو کچھ اس سینار میں کہا، مخلصانہ کہا۔

خدا کرے کہ میں بھی اس سے فائدہ اٹھاؤں اور آپ بھی اپنے جوہر اور کمالات میں اضافہ کریں۔

بھارت میں

الحق

خواہشمند

بھارت میں جو حضرات ماہنامہ الحق جاری رکھنے کے خواہشمند ہیں وہ اس کا سالانہ

چندہ بذریعہ عام ڈاک -/۳۵ روپے اور ہوائی ڈاک سے -/۷۰ روپے پندرہ

الداعی دارالعلوم دیوبند، کو بھیج کر رسید ہمیں ارسال فرمادیں یہاں سے پریچ جاری

کر دیا جائے گا۔ الداعی کو رقم بھیجتے ہوئے یہ وضاحت ضرور کریں کہ یہ ماہنامہ

(الحق کوڑہ خشک)